© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

پاکستانی مؤرخین اور مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہماری سوسائٹی مختلف مذہبی مکاتیب فکر میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ہماری سماجی زندگی، قومی وملی مسائل اور کارگزاریوں اور طرزِ فکر پر ان کی مہر لگی ہوئی ہے اور مسلمانوں کے ذہنوں پر ان کی سخت گرفت ہے۔ اگر ہم ان پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو جو کچھ ان کا فہم ہے، بہت آسان ہو جائے گا۔

۱۔ حضرت شاہ ولی الہ محدث دہلوی کے طرزِ فکر، ان کے دینی، سماجی اور معشرتی مجتہدات نے جو ایک مکتب فکر پیدا کر دیا تھا۔ پچھلی تین صدیوں میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی، فکری اور انقلابی مکتب فکر رہا ہے۔ اہل حدیث اور دیوبندی اہل سنت والجماعت اگرچہ اب الگ الگ منظّم ہو کر دو مختلف مکاتب فکر بن گئے ہیں اور پھر وہ بھی تقسیم در تقسیم کے عمل کے بعد کئی دھڑے بن گئے۔ اسی مکتب فکر کے یہ دو اہم اور معتبر رکن ہیں اور دونوں حضرت محدث دہلوی سے نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو حضرت شاہ صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے اور ان کے جانشین ہوئے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت شاہ عالم ثانی کی نام نہاد حکومت قائم تھی۔ یہ اعلان اصطلاحاً ایک فتوے کی صورت میں تھا لیکن آج مجرد اس اعلان نے انگریزوں کے خلاف اور ان سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے طبل جنگ بجا دیا تھا۔ اس اعلان کی اسلامی نوعیت اور فتوے کی شرعی حیثیت نے مسلمانوں پر فرض کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے قبضہ واستیلا سے ملک کو آزاد کرائیں۔

۲۔ دوسرا بریلوی مکتبہ فکر تھا جس کے بانی مبانی مولانا احمد رضا خاں تھے، ان کا مشہور فتویٰ ''الاعلام بان الہند دارالاسلام'' بہت مشہور ہے۔ جس نے انگریزوں کے ملک پر قبضہ وتسلط کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ انگریزوں کے قبضے سے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے فتوے کے سو سال سے زیادہ مدت بعد کا فتویٰ ہے جب کہ انگریز ہندوستان کے چار کھونٹ پر قبضہ کر چکا تھا۔ یہ ''اعلام'' شاہ عبدالعزیز کے فتوے کی کھلی مخالفت اور اس کا رد تھا۔

۳۔ علمائے بدایون اعلام کی اشاعت سے پہلے سے یہی خیالات رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کی تحقیق بھی یہی تھی اہل حدیث میں بھی اس خیال کی ایک جماعت موجود تھی اور دیوبندی بزرگوں میں ان کی شاخ کے علماء بھی اس ذوق سے ناآشنا نہ تھے۔

۴۔ علی گڑھ کے بزرگ نے اگرچہ کسی مذہبی مکتب فکر کی بنیاد نہیں ڈالی تھی لیکن ایک پختہ سیاسی مکتب فکر پیدا کر دیا تھا جو برٹش حکومت اور اس کے اقتدار کے بارے میں شدید جذبات سے تعمیر ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے لئے خدا کی رحمت اور اس کا سایہ ہے۔ ان کی دعا تھی کہ انگریزی حکومت تا دیر ہی قائم نہ رہے بلکہ وہ دائمی اور ابدی ہو۔

اہل علم اور اصحاب نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ان بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ تحریک آزادی وطن میں حصہ نہیں لیا بلکہ آزادی کی تحریک کی مخالفت کی۔ آزادی کے رہنماؤں شجاع الدولہ، سلطان ٹیپو وغیرہ کو بے وقوف کہا اور یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ انہیں انگریزوں کی مخالفت مول نہیں لینی چاہیے تھی ۔جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین کو اتنی گالیاں دی گئیں کہ شاید تاریخ میں کسی جماعت کو نہ دی گئی ہوں گی۔اگرچہ سرسید مرحوم کے بعد علی گڑھ کے طلبہ کی ایک جماعت گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوئی اور وہ اپنے قدم تحریک آزدی وطن کے میدانِ تگ وتاز سے روک نہ سکی۔سیاسی مسلک کے اعتبار سے یہ سرسید مرحوم سے باغی جماعت تھی۔

اب میں آپ حضرات کو اس طرف توجہ دلاؤں گا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ولی اللٰہی مکتبِ فکر کی ایک اہم شخصیت تھے اور اس بات پر پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اس کی حیثیت کو بدلنے کے لیے جدوجہد اسلامی فریضہ اور داخل جہاد ہے۔اب غور فرمائیے کہ دارالحرب کے مخالفین اور انگریزی حکومت کو ’’دارالاسلام‘‘ سمجھنے والوں کو ابوالکلام کا دشمن ہونا چاہئے تھا یا دوست؟ آپ اسے دشمنی نہ کہیے ۔تضاد بھی تھا تو اتنا شدید کہ یہ دونوں کبھی ایک جھنڈے کے تلے جمع نہیں ہوسکتے تھے۔اس کا اندازہ سرسید مرحوم کے اس جوش سے لگایا جاسکتا ہے جو کانگریس کی مخالفت میں اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کے بارے میں انہیں تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ولی اللٰہی تھے لیکن ولی اللٰہی فکر کی دیوبندی اور اہل حدیث دونوں ’’جماعتوں‘‘ سے ان کا تعلق نہ تھا۔دونوں جماعتوں میں دوگروپ شروع ہی سے نہ ان کے حمایتی تھے اور نہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔میرا اشارہ دیوبند کے تھانوی اور اہل حدیث کے بٹالوی کی طرف ہے۔البتہ دیوبند کے انقلابی گروپ جس کے رہنما سید حسین مدنی اور اہل حدیث پنجاب کے قصوری اور امرتسر کے غزنوی خانوں اور بہار و بنگال میں اہل حدیث مکتبِ فکر کی ایک بڑی جماعت سے ان کے ہمیشہ بہت گہرے تعلقات رہے تھے خصوصاً عظیم آباد کے خاندان رفیع الارکان کے وہ نہایت عقیدت کیش تھے اور ان کے اخلاف سعید سے ان کے اچھے تعلقات آخر تک رہے۔

اور جن جماعتوں اور گروہوں نے مولانا آزاد سے اختلاف کیا تھا،ان کا دائرہ تنقید و تردید سیاست تک ہی کہاں تھا ان میں بعض کو ہمارے بزرگوں کا خدا اور اس کے رسول پر ایمان بھی قبول نہ تھا۔سیاسی اختلافات کیوں کر رفع ہوسکتے تھے ،جو شکایات انہیں ہمارے بزرگوں سے تھیں،وہ نہ ہوتیں تو دوسری پیدا کرلیتے ۔ان کی سیرت کی خوبی تائید وحمایت کے بجائے تردید ومخالفت میں نمایاں ہوئی۔

مذکورہ مکاتب اوران کے فروغ کے سوا بریلوی ،بدایونی ،فرنگی محلی ،علی گڑھ مکاتب فکر کے بعض افراد سے مولانا آزاد کے اخلاقی مروت کے تعلقات ضرور تھے لیکن مجموعی طور پر ان سے لگاؤ کے نہیں لاگ کا تعلق تھا۔

اس تجربے کی بعد جب ہم وقت کے اہل علم اور اصحاب قلم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا تعلق کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے تھا۔کوئی ایسا نہ تھا جسے اس کے ذوق علمی اور سیرت کی بنا پر مؤرخ کہا جائے ۔جیسا کہ ہم نے جادوناتھ سرکار، ڈاکٹر تاراچند، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی جیسے مؤرخین کی شہرت سنی ہے۔

یہ تصریح میں نے اس لئے کی ہے کہ میرے خیال میں ہر وہ تعلیم یافتہ جس نے تاریخ، یا سیاسیات میں ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی ہو وہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تاریخ وسیاسیات پڑھانے کا استحقاق حاصل کرلیتا ہے یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استاد بن جاتا ہے، مؤرخ اور سیاست داں کہلانے کا مستحق نہیں ہو جاتا۔

ایسا بھی نہ تھا کہ میدان قابل اور دیانت دار مؤرخین سے بالکل ہی خالی ہو۔ بلاشبہ بہت سے حضرات جن کے ہاتھ میں قلم اور منہ میں زبان تھی، انہوں نے اپنے آپ کو پاکستان کے رہنماؤں میں شمار کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ ان کی بعض تحریریں اخلاق کے نام پر دھبہ ہیں۔ ایسے اہل قلم اور مؤرخین میں مہاجر بہ کثرت تھے۔ ایک صاحب نے انڈیا ونس فریڈم کی اشاعت پر ایک چٹپٹی تنقید پڑھ کر بیان دیا کہ مولانا آزاد جن کا کھاتے ہیں انہی کا گائیں اسلام پر رحم فرمائیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب کی کتاب پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا مسلم لیگ کا دفاع خوب فرمایا۔ ایک صاحب نے ابوالکلام اور حسین احمد کے خلاف دشنام کا اچھا مجموعہ مرتب کر دیا۔ لکھنؤ کے ایک صاحب کو صرف اس بات سے غرض تھی کہ ۱۹۳۷ء کی وزارت سازی کے سلسلے میں مولانا نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مولانا کے بیان سے مسلم لیگ سے ان کے اخلاص پر زد پڑتی تھی۔ یہ بات ان کے مفاد کے خلاف تھی۔ حالانکہ ان کے لکھنؤ ہی کے دو ساتھیوں نے ان کے بیان کی تردید کر دی اور کئی دوسرے حضرات جن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی شریک تھے، ان کے بیان کی تردید اور حالات کی وضاحت تفصیل سے کر دی۔ ایک صاحب نے ''پاکستان کی تاثراتی تاریخ'' تحریر فرمائی۔ اب جب تک تاثرتی تاریخ کو ایک تاریخ کی ایک اعلیٰ قسم نہ تسلیم کر لیا جائے اس پر تبصرہ و تنقید کی نظر کیوں کر ڈالی جاسکتی ہے۔ ایک صاحب جو برسہا برس تک اخبار میں صرف قائداعظم اور تحریک پاکستان کے ہی پر مضامین لکھتے رہے تھے ان کے خیال میں انہی دونوں موضوعات پر کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی۔ ایک صاحب نے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری چند برسوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس میں نہایت شوق و دل چسپی سے لکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد پنجابی النسل تھے اور ان کے باپ دادا کھیم کرن ضلع سیالکوٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس سے رجوع کر لیا اور میرے بزرگ دوست شورش کاشمیری سے معذرت کر لی اور مرحوم شورش نے ان کی معذرت قبول کر لی۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنے دوست کی روح کو بے چین کروں۔ کھیم کرن سے مولانا آزاد کے باپ دادا کے تعلق کو اسی ماخذ سے ''تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت'' کے مؤلف نے بھی بیان کیا ہے لیکن غیر معتبر روایت اور ناکافی حوالہ گرچہ اسلوب بیان قدرے سلجھا ہوا ان کا انتقال ہو گیا، زندہ ہوتے تو کیا تعجب کہ وہ بھی رجوع کر لیتے۔ مولانا آزاد کی سیاسی شخصیت اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد پر تنقید بھی کی گئی لیکن جیسے جیسے ۴۵ء تا ۴۶ء کا فاصلہ بڑھتا گیا۔ لوگوں کی جذباتیت کم ہوتی گئی۔ فضا پرسکون ہوتی گئی۔ تنقید میں کمی، سنجیدگی اور توازن پیدا ہوتا گیا۔ اب صاف صاف اعتراف کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا مسئلہ تحریک آزادی کے اول روز سے نہ تھا۔ ایک درمیانی دور میں پیدا ہوا۔ تحریک پاکستان تحریک آزادی ہی کی ایک شاخ ہے۔ مولانا آزاد تحریک آزادی کے رہنما اور مجاہد تھے اس لئے اس کی شاخ کی سیرابی میں ان کے حصے کا انکار کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی تاریخوں اور تذکروں میں بے محابا اعتراف اور راست تعریف اور مدح نہیں ہوتی۔ ذہنی تحفظ ضرور ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ گرد و پیش کا تقاضا اور مخصوص فضا کا لازمہ ہوتا ہے۔ بہر حال مولانا آزاد کی سیاسی شخصیت، ان کی حقیقت پسندی، ان کی راست فکری اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید مرحوم کے مسلک کے ایک مؤرخ نے آزادی کی تحریک کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی اور اس اصول پر کہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ غیر منظّم اور بے نتیجہ تھا لیکن وہ سرسید مرحوم کے خیالات کے مطابق محض غدار اور فساد نہ تھا۔ جنگ آزادی وطن پر جان نچھاور کرنے والے تھے۔ شجاع الدولہ، سلطان ٹیپو وغیرہ بے وقوف نہیں سچے جان نثاران وطن تھے۔ آزادی اور اسکے نتیجے میں پاکستان کا وجود میں آنا انہی جاں بازان وطن کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ان قربانیوں کے بغیر حصول آزادی کا خواب پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ مولانا آزاد کو زبردست خراج عقیدت ہے۔

اسی مسلک اور مکتب فکر کے ایک دوسرے مؤرخ نے ''علماء میدان سیاست میں'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ انہوں نے علماء کے ذوق حریت پسندی اور ان کے ایثار اور قربانیوں کا ذکر کیا اور شروع سے آخر تک اور متقدمین سے متأخرین تک علماء کے تذکار میں ان کے احترام کو روا رکھا اور ان کی خدمات کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا۔ ان کا انداز فکر ناقدانہ ہے لیکن کسی کے شخصی احترام سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس میں مولانا محمود حسنؒ محدث دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی ہیں۔ ان کی سیاست پر تنقید سے بھی کام لیا اور اختلاف بھی کیا ہے۔ لیکن حضرات! ہم نے ان کے حق اختلاف سے کب انکار کیا تھا جب کہ ہم ان کی سیاست کو نشانہ تنقید بنا چکے ہیں تو ان کو تنقید سے کیوں کر روک سکتے ہیں۔ اس کا تو ہم دل میں بھی خیال نہیں لا سکتے۔ ہم ان کی تنقید کے ہرگز شکوہ سنج نہیں۔ ڈاکٹر ایس معین الحق اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دونوں کے رویے شریفانہ اور انداز تحریر علمی اور تنقید متوازن ہے۔ ہم تو بہت پہلے سے محمد علی جناح، ان کے رفقائے سیاست ان کے کارکنوں ان کے صحافیوں اور اہل قلم سے شریفانہ رویے کی توقع رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ کے واقعات اور جنگ آزادی کے مجاہدین کے بارے میں قریشی مرحوم کا رویہ بھی وہی ہے جو ایس معین الحق کا ہے۔

ہم ان بزرگ مؤرخین کو کیوں کر رد کر سکتے ہیں جن کی حقیقت پسندی نے ان کے بزرگوں کے غیر حقیقت پسندانہ سوچ کو ترک کر کے اور برٹش حکومت کے سایہ رحمت کے تصور اور ان کے دوامی ہونے کے عقیدے سے تائب ہو چکے ہوں اور وہ ہمارے بڑے قابل احترام بزرگ ہیں۔ ان کی عزت کرنا ہم پر لازم ہے۔ ان حضرات کا یہ رویہ ۱۹۷۰ کے بعد سامنے آیا۔ جب کہ ۴۶۔۱۹۴۵ کے الیکشن کے زمانے کے بزرگ ختم ہو چکے تھے اور اس وقت کے نوجوان بڑھاپے کی حدود میں پہنچ کر جوش سے عاری ہو چکے تھے اور خیالات میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو گیا تھا۔

بعض کتابیں قیام پاکستان کے ابتدائی ایام میں لکھی گئی تھیں۔ اس وقت تک صحافیوں اور کارکنوں کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ کے نعروں کی گونج دماغوں میں باقی تھی۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کا جوش بے چین کیے ہوئے تھا۔ ان کتابوں کی کمزوری یہ تھی کہ پاکستان کی تجویز کو تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ سمجھ لیا گیا تھا۔ حال آں کہ اس پر مسلمانوں ہی کا نہیں جنگ آزادی کے فریق غیر مسلم برادران وطن اور برٹش انتظامیہ کا اتفاق ہونا بھی ضروری تھا۔ ۳/جون ۱۹۴۷ سے پہلے یہ نظریہ زیر تصفیہ تھا اور ضروری تھا کہ بحث و نظر کا ہدف بنے۔ ۳/جون کو بالآخر تصفیہ ہو گیا۔ تقسیم کے فارمولے اور عمل سے بہت سی خوش فہمیوں پر اوس پڑ گئی۔ ایک غلطی کہ نظریۂ پاکستان کو اسلام کا مترادف سمجھ لیا گیا۔ بعد کی غلطی یہ ہوئی کہ ابوالکلام و حسین احمد مدنی کو نظریۂ پاکستان کا یعنی اسلام اور مسلمانوں کا دشمن سمجھ لیا گیا۔ اور جو تھا نا خوب وہی خوب ہوا ان کے لئے ہر ناروا ہو گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح غصے اور اشتعال میں آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں جوش وجذبات کے عالم میں حقیقت اور سچائی بھی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے ایسے عالم میں آدمی کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ابوالکلام کے ساتھ بھی یہ ظلم روا رکھا گیا۔اب اس کا شکوہ لا حاصل ہے۔تاریخ اپنے کتنے ہی اوراق پلٹ چکی ہے۔جو وقت گزر چکا ہے پلٹ کر نہیں آسکتا۔پاکستان ناگزیر تھا۔تاریخ پاکستان کے اسی ابتدائی دور کی کتاب ہے اگر جوش وجذبات اور خوش فہمیوں کی کوئی قیمت ہو تو گراں بہا تصنیف ہے۔

اسی دور کی متعدد کتابوں میں مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کی داد دی گئی ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ''شو بوائے'' کہا گیا تھا۔لیکن پیرزادہ عبدالستار جو اس وقت مسٹر محمد علی جناح کے پرائیویٹ سکریٹری تھے کا بیان ہے کہ جناح صاحب سے اس بیان کی نسبت درست نہیں۔اگرچہ بات ایسی نہیں لیکن پیرزادہ صاحب کے بیان کو چیلنج کرنا مقصود نہیں۔اب اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

حضرات! مؤرخین میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بھی ہیں۔جن کی زبان وقلم پر مولانا آزاد کے لئے ہمیشہ کلمۂ خیر ہی آیا۔مولانا غلام رسول مہر، مولانا آزاد کے عاشق صادق تھے۔انہوں نے پاکستان میں مولانا کے مطالعے اور تذکرے کا جواز پیدا کیا۔شورش کاشمیری' مولانا آزاد کے عقیدت کیش تھے۔انہوں نے مولانا سے محبت کرنے کی تحریک پیدا کی۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے اخلاق وسیرت سے اپنے درس وصحبت سے مولانا کی سیرت کے نقش اجاگر کیے۔شورش نے ۱۹۵۸ میں ابوالکلام اکادمی لاہور ڈاکٹر سید عبداللہ کی صدارت میں قائم کی اور خاکسار کو اس کا سکرٹری بنایا۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنا توبہ نامہ اور معذرت چھپوا کر اپنی طبع کی سلامتی ذہن کے توازن، قلم کی دیانت اور سچائی سے اپنے عشق کا ثبوت دیا۔

ان کے ساتھ مرزا ادیب اور احمد ندیم قاسمی کو بھی شامل کر لیجئے یہ مشہور اہل قلم ہیں۔ان کے قلم اجمالاً اور تفصیلاً اور ضمناً اور مستقلاً اتنی بار مولانا آزاد کا تذکرہ محبت اور عقیدت اور احترام وتواضع سے کر چکے ہیں کہ شمار نہیں کیا جاسکتا۔ابوالکلام کا جب تذکرہ کیا عقیدت ومحبت کے ساتھ کیا۔مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب جو اہل حدیث مکتب فکر کی ایک اہم شخصیت ہیں، مؤرخ اور وقائع نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ان کے ذوق کی بلندی، طبع کی سلامتی، ذہن کے توازن اور قلم کی دیانت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ کتب خانہ خدا بخش کی مطبوعہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ فرمالیں اور کسی تردد میں نہ پڑیں۔

مولانا آزاد کے بارے میں اہل علم، اصحاب نظر، ماہرین تعلیم جن میں مؤرخین بھی شامل ہیں ان کے موجودہ رویے کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام میں جہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے کوئی صحبت بہم نہ تھی، سرکاری کالجوں اور لائبریریوں میں ابوالکلام کی کتابوں کی خریداری پر پابندی تھی۔آج پاکستان میں ان کے نام پر لائبریریاں اور تحقیقی ادارے قائم ہیں۔ایسے پبلشرز ہیں جو صرف ابوالکلام کی کتابیں اور ان پر کتابیں چھاپتے ہیں۔اور پاکستان کی تقریباً ۱۰۰ یونیورسٹیوں میں اور ان کے اردو، اسلامیات، صحافت، تعلیم، سیاسیات کے شعبوں میں ابوالکلام کے مقالات وکتب نصاب میں شامل ہیں۔ایم۔اے کے تحقیقی مقالات سے لیکر ایم فیل اور پی ایچ ڈی تک کے پچاسوں مقالات لکھے جاچکے ہیں اور مستقبل کے لئے فتح ابواب میں مزید تحقیق کیلئے وسیع امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔

© rasailojaraid.com